بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نظرات

جنگ اور تمدن

دو مہینے سے یورپ کی فضا میں جنگ کے جس طوفان رعد و برق نے نہ صرف یورپ بلکہ مشرق و مغرب کے تمام ملکوں میں سکون و اطمینان کی نیند حرام کردی ہے وہ اپنے نتائج کے اعتبار سے خواہ کتنا ہی ہولناک اور تباہ کن طوفان ہو لیکن ہم کو اس پر نہ کوئی حیرت ہونی چاہیے اور نہ تعجب۔ جب تک انسان انسان ہے اور اس میں خیر و شر کی صلاحیتیں، اور جلبِ ملائم و دفع ناملائم کی قوتیں موجود ہیں اُس کے لیے جنگ ناگزیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس طرح لوگ دورِ وحشت و بربریت میں لڑتے تھے، درندوں کی طرح ایک دوسرے کو پھاڑ کھانے کی کوشش کرتے تھے۔ اور کرگس و وال کی مانند انسانی اعضا پر جشن ضیافت کا سامان کرتے تھے، ٹھیک اسی طرح آج بھی جبکہ تہذیب و تمدن کے آفتاب کی ضیا رسانی نے دنیا کو ایک "شہرستان جمال و نور" میں تبدیل کردیا ہے ایک قوم دوسری قوم سے دست و گریباں ہے اور ایک ملک دوسرے ملک کی وسعتوں کو اپنے سینہ میں سمیٹ کر خود پھیل جانا چاہتا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ سے پانچ ہزار قبل کے عہد میں جس کو زمانۂ قبل تاریخ کہا جاتا ہے، لوگ لڑتے ہونگے تو اُن کے ہتھیار اُن کے ناخن، دانت اور گھونسے

ہوتے ہونگے جس سے نقصان زیادہ نہیں ہوتا ہوگا - اور جو کچھ ہوتا بھی ہوگا، فریقین تک ہی محدود رہتا ہوگا لیکن آج سائنس کے دستِ گستاخ نے فطرت کے چھپے ہوئے رازوں سے نقاب اُلٹ دی ہے اور زمین نے اپنے پوشیدہ خزانے انسانی تمدن کی خدمت کے لیے اُگل دیے ہیں یہ سائنس کی انھی ارزاں کرم پاشیوں کا صدقہ ہے کہ جرمنی کا دیو جان شکار چار کروڑ کے قریب وسیع آبادی رکھنے والے پولینڈ کو نو اور نو اٹھارہ دن میں ہڑپ کر گیا، اور اُس کا نام نقشۂ عالم سے اس طرح مٹا دیا کہ گویا وہ کوئی حرف غلط تھا جو کاتبِ تقدیر کی عجلت نگاری کے باعث لوحِ ہستی پر نمودار ہو گیا تھا یا وہ طاقت و قوت کے متلاطم سمندر کا کوئی بُلبلہ تھا جس نے سطحِ آب پر پہنچ کر ذرا آنکھ کھولی ہی تھی کہ پھر غرور و گھمنڈ کے تھپیڑوں نے اُس کی انفرادیت کو فنا کر کے اپنے میں شامل کر لیا۔

شیکسپیر کے لفظوں میں دنیا ایک اسٹیج ہے جس پر قومیں باری باری سے عزت و شان کے ساتھ نمودار ہوتی ہیں، اور دنیا کی تاریخ میں جو پارٹ ادا کرنا انکی تقدیر میں لکھا ہوتا ہے اُسے ادا کرتی ہیں، اُس کے بعد پھر اُن پر ایک ایسا دورِ خمول و گمنامی طاری ہو جاتا ہے کہ اُن کی جگہ دوسری قومیں لے لیتی ہیں - جو سربلند و سرفراز ہوتا ہے اُس کے حصہ میں پستی و خواری آتی ہے، اور جو ذلت و حقارت سے دیکھا جاتا تھا اُس کے سر پر شہنشاہی و فرمانروائی کا تاج چمکنے لگتا ہے۔ اللہ کی سُنت یونہی جاری ہے اور قیامت تک اسی طرح جاری رہیگی ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا

مسٹر ہوبس نے (Hobbus) جو فلسفۂ نفسیاتِ اقوام کا مشہور عالم ہے جنگ سے متعلق اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے۔

انسانی فطرت کا عمیق مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی فطرت میں اصولی طور پر تین چیزیں

ایسی ہیں جو جنگ کا سبب بنتی ہیں (۱) مقابلہ کی خواہش (۲) مدافعت کا جذبہ (۳) عزت و وجاہت حاصل کرنے کی آرزو"

پھر بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ جنگ کا دوسرا سبب پہلے سبب پر منتج ہو جاتا ہے یعنی ایک قوم شروع شروع میں اپنی قومی حفاظت وصیانت کی خاطر جنگ کرتی ہے لیکن جب اُس کو اپنے مقصد میں کامیاب ہو جانے کے بعد غیر معمولی قوت و طاقت حاصل ہو جاتی ہے تو اب اپنی قوت کی نمائش، اپنی طاقت وسطوت کا اظہار، خود اُس کا ایک مستقل مقصد بن جاتا ہے۔ چنانچہ انگلستان کا مشہور انشا پرداز فلسفی ڈبلیو، پی پٹرسن (W.P. Patterson) لکھتا ہے۔

"یہ صحیح ہے کہ اپنے علاقوں کو محفوظ رکھنے اور اپنے ملکی پروگرام کو نافذ کرنے کے لیے طاقت کا حاصل کرنا ضروری ہے، اور اس لیے اگر کوئی قوم اپنے لیے طاقت وقوت کا مطالبہ کرتی ہے تو ہم اسے ناحق نہیں کہہ سکتے لیکن عام افراد کی طرح عموماً دیکھا گیا ہے کہ جماعتیں بھی طاقت حاصل ہو جانے کے بعد پھر طاقت کی نمائش کو ہی اپنا ایک مستقل مقصد بنا لیتی ہیں"۔

موجودہ جنگ کے اسباب وعلل پر اگر ایک سرسری اور محض سطحی نگاہ ڈالی جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ آج یورپ میں جو کچھ ہو رہا ہے اس نظریہ کی صاف اور کھلی شہادت ہے۔ لیکن اگر یورپ کے عہد جدید پر جس کا آغاز سولھویں صدی کے شروع سے ہوتا ہے۔ ایک تاریخی اور سیاسی نگاہ ڈالی جائے تو یہ بآسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ آج جو کچھ ہو رہا ہے گذشتہ حالات وواقعات کا لازمی نتیجہ ہے اور اس لیے اب اگر جنگ ملتوی بھی ہو جائے تو جب تک اصل اسباب کی اصلاح نہیں ہوگی، اور اُس ذہنیت کو تبدیل نہیں کیا جائیگا جو ان تمام ہولناکیوں کی واحد ذمہ دار ہے۔ یورپ کو چین اور

امن نصیب نہیں ہو سکتا۔

اصل یہ ہے کہ یورپ کی مختلف حکومتوں میں سے ہر ایک حکومت اپنے مخصوص سیاسی رجحانات اور ملکی و قومی روایات کے باعث سولھویں صدی کے آغاز سے اب تک اس فکر میں رہی ہے کہ وہ دوسری حکومتوں کو مغلوب کر کے اور اُنھیں اپنا محکوم بنا کر خود تمام یورپ پر قابض ہو جائے۔ اس چار صد سالہ یورپ کی سیاسی تاریخ میں آپ کو نمایاں طور پر معلوم ہوگا کہ آسٹریا، اسپین، فرانس اور جرمنی ان میں سے ہر ایک نے جب کبھی فوجی طاقت حاصل کی اُس نے تمام براعظم یورپ پر حکمراں ہو جانے کے لیے اپنی کوششوں کو وقف کر دیا۔ دوسری طرف برطانیہ کی یہ کوشش رہی ہے کہ یورپین سیادت پر قابو رکھنے کے لیے وہ خود بحری طاقتوں پر قابض رہے۔ اس کشمکش اور تنازع نے جب کبھی نازک صورت اختیار کی وہ جنگ کی شکل میں ظاہر ہوئی چنانچہ جنگ سیزدہ سالہ (Thirty years war) اسپین کی تخت نشینی کی جنگ (The war of Spanish succession) آسٹریا کی تخت نشینی کی جنگ (The war of Austrian succession) پھر نپولین کی لڑائیاں اور سب سے آخر میں جنگ عظیم جو ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک جاری رہی اور جس نے یورپ ہی یورپ کے ایک کروڑ آدمیوں کا خاتمہ کر کے رکھ دیا۔ یورپ کے بڑے بڑے علاقے قحط اور وبا کی کثرت کے باعث ویران و تباہ ہو گئے اور جس نے سوسائٹی کے نظام اقتصادی و معاشری کو درہم برہم کر کے رکھ دیا۔ یہ سب کچھ درحقیقت اسی قومی و ملکی عصبیت و رقابت کا نتیجہ تھا جو قوت حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ نامحسوس طریقہ پر خود بھی قوی ہوتی رہتی ہے۔

اس رکیک مستعمرانہ ذہنیت کو آج کل دو چیزوں نے اور زیادہ قوت بہم پہنچائی ہے جس کی وجہ سے اب یہ ذہنیت چنگاری نہیں بلکہ ایک ہولناک دوزخ بن گئی ہے۔ ان میں کی پہلی چیز

سائنس کی غیر معمولی ترقی ہے جس کے باعث آناً فاناً میں بڑی سے بڑی آبادی کو چند لمحوں میں خاکستر بنایا جا سکتا ہے اور طویل وعریض سمندروں اور جنگلوں اور اونچے اونچے پہاڑوں کو عبور کر کے آسانی ایک براعظم سے دوسرے براعظم میں پہنچا جا سکتا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سائنس کی عجوبہ کاریوں نے انسانی عقل و فہم کی بلند پروازی کی ایک ایسی نادر مثال پیش کی ہے کہ اگر اب سے ڈیڑھ سو برس پہلے کے لوگ آج دنیا میں پھر واپس بھیجدیے جائیں اور وہ عہد حاضر کی حیرت انگیز ایجادات و اختراعات کو دیکھیں تو یقیناً اُن کو گمان ہوگا کہ وہ پہلی دنیا میں نہیں بلکہ "طلسم ہوشربا" کے کسی خیالی طلسم کدہ میں بھیج دیے گئے ہیں۔ سیگنٹ اور سگفرڈ لائن کی جو تفصیلات اخباروں میں آئی ہیں اُن کو پڑھ کر خیال ہوتا ہے کہ یہ انسانی نہیں جناتی قلعے ہیں لیکن غور کرنے کی بات یہ ہے کہ کیا آج سائنس کی تمام طاقت انسانوں کی بربادی، شہروں کی تباہی اور آبادیوں کی ویرانی کے لیے زیادہ سے زیادہ اور موثر تر سامان و اسلحہ پیدا کرنے کے لیے وقف نہیں ہے اور کیا ہر وہ حکومت جو اپنے پاس سب سے زیادہ اسلحہ و سامان جنگ رکھتی ہے، غرور کے نشہ سے مست ہو کر دوسری کمزور حکومتوں پر دندان حرص و آز نہیں تیز کر رہی ہے۔ بس یوں کہیے ذہنیت پہلے ہی جنگجویانہ تھی، سائنس نے اپنی مدد سے اس کو اور مشتعل کر دیا۔

دوسری چیز جو یورپ کے گلے میں اس وقت کانٹا بن کر اٹک گئی ہے، قومیت و جمہوریت کے دو نظریوں کی پرورش و ترقی ہے، یہاں قومیت سے مُرادوہ قومیت ہے جس کی اساس وطنیت پر قائم ہے، جرمنی ایک جدا قوم ہے، اٹلی الگ ایک قوم ہے اور یہ دونوں جرمنیت و اطالویت پر اس درجہ نازاں ہیں کہ اپنی قوم کو یورپ کے تمام اقوام سے افضل و اعلیٰ جانتے ہیں۔ قومیت کا ظہور مختلف شکلوں میں ہو رہا ہے۔ نازیزم، فاشزم وغیرہ اس کے مختلف عنوانات ہیں ورنہ دراصل عنوان ایک ہی ہے۔ قومیت کے مقابلہ میں نظریہ جمہوریت ہے لیکن یہ نظریہ آج کل جس خط و خال اور آب و

رنگ کے ساتھ یورپ میں موجود ہے نفسیاتی طور پر اس کا لازمی نتیجہ تصادم و تزاحم ہی ہوسکتا ہے اور بس۔ غرض یہ ہے کہ سائنس کی ترقی، اور نظریہ قومیت وجمہوریت کا اختلاف اور اُس کی اصل بنیاد ان دونوں چیزوں نے اُس قدیم چہار صد سالہ ذہنیت پر "آتش درخرمن" کا کام کیا ہے۔ اور یہی باعث ہے کہ آج یورپ کا امن وامان اور اُس کی تہذیب وتمدن عظیم خطرہ میں ہے۔

اب اس خطرہ سے نہ تمدن کی جگمگاہٹ بچاسکتی ہے اور نہ سائنس کی ترقیات ہی اُس کے لیے رُکاوٹ بن سکتی ہیں۔ کیونکہ سائنس کی ترقیات انسانی زندگی کے لیے وبال جان بنی ہوئی ہیں اور تمدن کی رفعت پذیریاں خود اپنی "شکست کی آواز" ہیں۔ گویا اس کا ہر تارنفس ہلاکت وبربادی کے رشتہ سے اس طرح مربوط ہے۔ کہ وہ غالب کی زبان میں پکار پکار کر کہہ رہا ہے:-

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

یہ واقعات اس امر کا زندہ ثبوت ہیں کہ جس تمدن کی اساس اصول اخلاق اور روحانیت پر قائم نہیں ہوتی بلکہ مادیت اور نفس پرستی وخودغرضی پر اُس کی تمام عمارت کا قیام ہوتا ہے وہ انسانیت کے لیے کبھی خوش آئند تمدن ثابت نہیں ہوسکتا۔ کیا آج اس سے انکار کیا جاسکتا ہے کہ جو انسان، مریخ وقمر میں آبادی تلاش کرنے کے بعد وہاں کی زبان معلوم کرنے کے درپے ہے، آسمان پر اُڑتا ہے، سمندر کی تہوں میں زندہ رہتا ہے، تین سو میل کی رفتار سے بھاگتا ہے۔ ہزاروں میل کی مسافت سے ایک دوسرے سے بات چیت کرتا ہے۔ ان تمام غیر معمولی مادی ترقیات کے باوجود خود اپنی روحانی زندگی کے اعتبار سے اس درجہ تہی مایہ ہے کہ دوسروں کے ساتھ ایک لمحہ بھی پُرامن زندگی بسر نہیں کرسکتا، اُس نے اپنے شہروں اور گھروں کو قسم قسم کی روشنیوں سے جگمگا رکھا ہے کہ جسے دیکھیے خطۂ نور معلوم ہوتا ہے لیکن اُس کے دل کی دنیا اس درجہ تاریک ہے کہ وہاں ایمانداری، دیانت اور مصالحت

کا نام ونشان بھی نہیں مل سکتا۔ مشرق کے شاعر فیلسوف اقبال نے کیا خوب کہا ہے:-

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا
ڈھونڈھنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

ایک دوسرا نتیجہ جو اس جنگ سے برآمد ہوتا ہے یہ ہے کہ امن و امان قائم رکھنے کے لیے خواہ کیسی ہی موثر تدبیریں عمل میں لائی جائیں۔ اور اس مقصد کے لیے کتنی ہی انجمنیں بنائی جائیں لیکن وہ اُس وقت تک کارگر نہیں ہوسکتیں جب تک کہ لڑنے والوں کی ذہنیت میں اخلاق و روحانیت کی تعلیمات کے ماتحت ایک ایسی تبدیلی پیدا نہ کردی جائے کہ وہ خود بخود انسانیت کے احترام پر مجبور ہوجائیں، اور اپنی اغراض سے بے پروا ہوکر دوسرے بھائیوں کے مفاد کو اہمیت دینے لگیں" اسلام نے جو سب سے بڑا کارنامہ کیا وہ یہی تھا کہ دنیا کی مختلف قوموں کو جو جرمنی اور برطانیہ سے زیادہ ایک دوسرے کی دشمن تھیں اُن میں احساس اخوت ومحبت پیدا کرکے شیر وشکر بنا دیا۔ اور اس کا واحد ذریعہ یہی ہوسکتا تھا کہ خواہشات نفسانی کے لات وعزیٰ سے انسانی توجہ کو ہٹا کر صرف ایک خدائے واحد کی طرف ان سب کو متوجہ کردیا، اور اُس نے صاف طور پر کہا، ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا وادعوہ خوفاً وطمعاً۔ ان رحمۃ اللہ قریب من المحسنین۔ (تم زمین میں اصلاح کے بعد فساد پیدا مت کرو اور خوف وطمع کی وجہ سے خدا کو پکارو۔ اس کی رحمت نیکوکاروں سے قریب ہے)

توکیا جارج برناڈشا کی پیشگوئی کے مطابق وہ وقت قریب آگیا ہے جبکہ بدنصیب ومظلوم انسانیت موجودہ تمدن کی تباہ کاریوں سے گھبرا کر ایک مرتبہ پھر (یادش بخیر) اُسی اسلامی تمدن کے دامن میں پناہ لینے کے لیے تحاشا دوڑ گئی جس نے باہمی بغض وعداوت کے انگاروں کو بجھا کر انسیت ومحبت کے لالہ زاروں میں اور نفرت ودشمنی کے جہنم کو سرد کرکے مساوات ورواداری کی بہشت میں تبدیل کردیا تھا۔ اولم یسیروا فی الارض فینظروا